Registered No. L. 4186

جلد ۲۱ — عدد ۳
۴، ۵، ۶

رمضان
شوال
ذی القعدہ
ذی الحجہ
۱۳۶۱ھ

۷۸۶

ماہ نامہ

# ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

# تفہیمات

## بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد دو روپے قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

# تنقیحات

**تنقیحات** — یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۸/- مجلد ۲/-/- محصولڈاک -/۴/-

# فہرست مضامین

## بابت ماہ رمضان و شوال سنہ ۶۱ھ (اکتوبر و نومبر سنہ ۴۲ء) جلد ۲۱ عدد ۳،۴



---

**معذرت** افسوس ہے کہ کاغذ کی نایابی کے سبب سے پرچے کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی۔ چار مہینہ سے کاغذ فراہم کرنے کے لئے انتہائی جدوجہد کی جا رہی ہے لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ بازار میں اول تو کاغذ ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو خفیہ طور پر دس بارہ گنی قیمت پر ملتا ہے۔ یہ چار مہینہ کے مشترک پرچے جو اس وقت شائع کئے جا رہے ہیں۔ دراصل رمضان اور شوال کے پرچے تھے اور اپنے وقت پر تیار کئے جا چکے تھے۔ مگر اسی وجہ سے رکے پڑے تھے اب مجبوراً انہیں چار مہینہ کا ایک پرچہ بنا کر شائع کیا جا رہا ہے اور اس کے لئے بھی کاغذ بڑی مشکل سے فراہم ہوا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی

---


باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس

سرکلر روڈ لاہور سے طبع کرا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا

مسلمان دنیا میں کہیں امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس تفسیر کی رو سے تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ نہ صرف تمام غیر مسلم حکومتوں کے خلاف بلکہ ان مسلمان حکومتوں کے خلاف بھی علَمِ جہاد بلند کریں جن میں اسلامی حدود و قوانین نافذ نہیں ہیں۔ اور جب یہ ہمارا نظریہ اور یہ ہمارا دینی فریضہ ہو تو کس طرح ممکن ہے کہ غیر مسلم ہم کو اپنا پُر امن ہمسایہ سمجھ کر باطمینان ہمارے ساتھ معاملت کر سکیں اور غیر مسلم حکومتیں اپنے حدودِ عمل میں ہمارے وجود کو برداشت کر سکیں؟

---

ان دلائل میں سے پہلی دلیل دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کسی شخص کا بجائے خود ایک عقیدے کو ماننا اور اپنی زندگی میں ایک خاص طریقہ کی پیروی کرنا، یہ اور چیز ہے اور اس کا اپنے نظریات کے مطابق اجتماعی زندگی کے لیے ایک نظام بنانا اور اس نظام کو بزور ایک ملک کے باشندوں پر جاری کر دینا بالکل ایک دوسری چیز۔ معترضین ان دونوں چیزوں کو ایک سمجھتے ہیں اور ان کے فرق کو نظر انداز کر کے لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ اور لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ وغیرہ آیات کو اس مجموعہ پر چسپاں کر دیتے ہیں، حالانکہ ان آیات کا تعلق صرف امرِ اول سے ہے۔ بلاشبہ ہم کسی غیر مسلم کو مجبور نہ کریں گے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر اسلامی عقیدہ قبول کرے یا اپنی مذہبی عبادات کو ترک کر کے نماز روزہ کی پابندی اختیار کرے۔ لیکن ہم اس کا یہ حق کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اخلاق، تعلیم، تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست وغیرہ اجتماعی امور کے متعلق اپنے نظریات کو حاکمانہ قوت کے ساتھ بجبر ہم پر مسلط کر دے۔ دوسروں کو ان کے مسلک پر چلنے دینا بے شک رواداری ہے، مگر یہ کوئی رواداری نہیں ہے کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلط برداشت کریں، حتیٰ کہ اگر وہ زنا کو حلال سمجھتے ہوں اور لوگوں کو اس کی عام اجازت دیتے ہوں تو ان کی حکومت میں بے بس رعیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے ہماری سوسائٹی میں زنا پھیلتی چلی جائے اور ہم اسے گوارا کریں، اگر وہ سود کو جائز سمجھتے ہوں اور خود ان کی حکومت سودی لین دین کرتی ہو تو ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی بڑے سے بڑا زاہد و متقی تک سود کے غبار سے نہ بچ سکے اور ہم ایک دیا سلائی اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ خرید سکیں جب تک کہ اس کی قیمت میں سے سود کا ایک حصہ بالواسطہ ٹیکسوں کی شکل میں ہماری جیب سے نہ نکل جائے، اگر وہ دہریت و الحاد کے نظریات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ملک کی عمومی تعلیم کا پورا انتظام انہی نظریات اور اسی ذہنیت اور اسی

ملحدانہ اخلاق پر تعمیر ہو جائے اور باشندگانِ ملک کے لیے ترقی و خوش حالی کے تمام دروازے اس جہنم کے دروازے کے سوا بند ہو جائیں اور ہمارا کوئی بڑے سے بڑا خدا پرست بھی اپنی نسل کو اس الحاد اور ملحدانہ اخلاق کے اثرات سے نہ بچا سکے، اگر وہ خدا کے قانون کو منسوخ کر کے خود قوانین بنائیں اور ملک کا نظام تمدن اُن قوانین پر قائم کریں تو ہماری معاشی و معاشرتی اور تمدنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مجبوراً اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور اُس قانون پر چلنے لگے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ کوئی ہمیں بتائے کہ آخر یہ رواداری کی کونسی قسم ہے اور لا اکراہ فی الدین کا یہ مطلب کس عقل کی رو سے صحیح ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے دین میں جو اکراہ ہو اُسے ہم برداشت کریں۔

---

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظم کو قائم کرنے کے لیے بہرحال ایک قوتِ قاہرہ کی ضرورت ہے جسے "اسٹیٹ" یا ریاست کہتے ہیں ــــ اس ضرورت کا انکار انارکی پر اعتقاد رکھنے والوں کے سوا آج تک کسی نے نہیں کیا، یا پھر اشتراکی تصوف میں ایک ایسے مقام کا تصور کیا گیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی حیاتِ اجتماعی اسٹیٹ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گی لیکن یہ صرف عالمِ خیال کی باتیں ہیں جن کی تائید میں کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی بتاتا ہے کہ تمدن کا قیام ایک قوتِ قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے ــــ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت جو اپنے قہر و غلبہ سے نظامِ تمدن کو قائم رکھتی ہے بجائے خود کسی نہ کسی نظریے اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک کی قائل ہوتی ہے، اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لیے ایک لائحۂ عمل بناتی ہے، اسی لائحۂ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے، اور تمدن کی شکل کے بننے اور بگڑنے میں اس قہر کی نوعیت اور اس لائحۂ عمل کی اصولی و تفصیلی صورت کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں، انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک طوعاً و کرہاً اس سانچے میں ڈھل کر رہتی ہے جسے اسٹیٹ اپنے قہر و تسلط سے بنا دیتا ہے۔ جو لوگ کسی اسٹیٹ کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بنیادی نظریہ اور اس کے تفصیلی لائحۂ عمل پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح اس پر راضی نہ ہوں، لیکن انھیں چاروناچار اپنے عقیدہ و مسلک کے ۹۰ فی صدی حصہ سے دست بردار ہو کر اسٹیٹ کے عقیدہ و مسلک

چلنا پڑتا ہے اور باقی دس فی صدی میں بھی ان کے عقیدہ و مسلک کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی چلی جاتی ہے۔

اسٹیٹ کی اس نوعیت کو ملحوظ رکھنے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ اجتماعی زندگی کے لیے اسٹیٹ بہرحال ہے ناگزیر، ایک صاحبِ فکر و نظر آدمی کے لیے اس حقیقت کا ادراک کچھ مشکل نہیں رہتا کہ جو گروہ آج کل کے محدود معنوں میں محض ایک "مذہب" کا معتقد نہ ہو بلکہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی یعنی "دین" پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اگر اپنے اعتقاد میں سچا ہی اور اپنے اعتقاد کے خلاف زندگی گزارنا نہیں چاہتا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر خود اس قوتِ قاہرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے جو نظمِ اجتماعی کی صورت گری کرتی ہی اور اپنے زور سے اس کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریگا تو دوسرے اس قوت پر قبضہ کریں گے اور پھر یہ گروہ مجبور ہوگا کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے کم از کم ۹۰ فی صدی امور میں اپنے "دین" کے بجائے اُن کے "دین" پر چلے۔ متمدن زندگی میں "اکراہ" لامحالہ ہم میں سے کسی ایک کو کرنا ہی پڑے گا، اگر ہم نہ کریں گے تو کفار کریں گے، لہٰذا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بجائے اس کے کہ کفار اس دائرے میں ہم پر اکراہ کریں اور ہمیں جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم اُن پر اکراہ کریں اور انھیں اس مقام کے قریب لا کھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو ان کو بآسانی جنت کا راستہ مل سکتا ہے۔

---

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہی، اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کا مالک اللہ ہے، اس کی زمین پر رہنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے، اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اُس کو پہنچتا ہے جو اس کا مطیعِ فرمان ہو اور اس کے قانونِ فطری و شرعی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ظالم ہے، عاصی ہے، باغی ہے۔ اس کی یہ نافرمانی صرف خلافِ حق ہی نہیں بلکہ زمین کے انتظام میں فساد اور اہلِ زمین کے لیے فتنہ کی موجب بھی ہے۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اُس کے قانونِ فطری و شرعی کی پیروی سے منحرف ہیں ان کو زمین میں جینے کا حق بھی نہیں ہے، لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت اور اس کا انتہائی حلم ہے کہ وہ ان کو نہ صرف جینے کی مہلت دیتا ہے، بلکہ ان کو ان کے کفر و شرک، دہریت و الحاد پر اس حد تک قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے جہاں تک ان کی بغاوت دوسرے بندگانِ خدا کے لیے فتنہ و فساد کی موجب نہ ہو سکے، البتہ وہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ لوگ اس کے قانونِ شرعی

کو منسوخ کرکے اپنے خود ساختہ قوانین پر اس کی زمین کا نظم و نسق چلائیں اور اس کی زمین کو فساد سے بھر دیں۔ اس لیے وہ اپنے قانونِ شرعی پر ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کفار کو دینِ حق پر ایمان لانے کے لیے تو مجبور نہ کرو، لیکن غلبۂ کفر و کفار کے فتنہ کو پوری طاقت سے مٹانے کی کوشش کرو یہاں تک کہ زمین کا انتظام عملاً میرے "دین" پر قائم ہو جائے اور جو میرے دین کو نہیں مانتے وہ "کابر" نہیں بلکہ "صاغر" بن کر رہیں۔

ان حقائق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد دوسری دلیل کا زور آپ سے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام فی الواقع خدا کے فرستادہ پیغمبر تھے تو پھر ان کی زندگی کا مشن بھی اُس کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا جو ہر رسولِ برحق کا مشن رہا ہے، یعنی خدا کے دین کو ہر دوسرے دین پر غالب کر دینا۔ اس مقصدِ وحید سے ہٹ کر جن لوگوں کی رائے میں حضرت یوسف دین اللہ کے بجائے دین الملک پر زمین کا انتظام کر رہے تھے ان کی رائے اگر تسلیم کر لی جائے تو یوسفِ صدیق اور سر سکندر و فضل الحق میں کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس معاملہ میں جو لوگ حقیقت سے دور چلے گئے ہیں انھوں نے دراصل قصۂ یوسف علیہ السلام کو نہیں سمجھا۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے وقت کے فرعون سے جو کہا تھا کہ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ، تو یہ ان کی طرف سے محض ملازمت کی ایک درخواست تھی جو دربارِ شاہی میں قبول ہو گئی اور ان کو وہ منصب مل گیا جو اکبر کے ہاں ٹوڈرمل کا منصب تھا۔ حالانکہ وہاں صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ابتداءً دینِ حق کی اقامت کے لیے وہی راستہ اختیار فرمایا تھا جو انبیاء علیہم السلام اختیار فرماتے رہے ہیں، یعنی دعوتِ عام، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کی تربیت و تنظیم، پھر انھیں ساتھ لے کر اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس دعوت کا سلسلہ جیل ہی میں شروع کر دیا تھا جس کے مواعظ میں سے ایک بے نظیر وعظ سورۂ یوسف کے پانچویں رکوع میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن آگے چل کر ان کے سامنے یکایک ایک ایسا موقع آگیا جس سے وہ اپنے مقصود تک مختصر راستہ سے پہنچ سکتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی اور اس کی سہیلیوں کے معاملہ میں جس پاکیزہ اور مضبوط سیرت کا اظہار اُن سے ہوا تھا

اور پھر تعبیر خواب کے معاملہ میں جس بصیرت کا ثبوت انھوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے فرعون ان کا اس حد تک معتقد ہو چکا ہے کہ اگر وہ اس وقت حکمرانی کے کامل اختیارات اس سے طلب کریں تو وہ بلا تامل پیش کر دے گا۔ اس لیے انھوں نے تحریکِ عمومی کی راہ سے اپنا مشن پورا کرنے کے بجائے اقتدارِ حکومت پر فوراً قبضہ کر کے دینِ حق قائم کر دینے کو زیادہ قریب کا راستہ پایا اور فرعون سے مطالبہ کر دیا کہ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ "زمینِ مصر کے تمام وسائل و ذرائع میرے اختیار میں دے"۔ یہ محض وزیرِ مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ڈکٹیٹرشپ کا مطالبہ تھا اور اس کے نتیجہ میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے (اس فرق کے ساتھ کہ اٹلی کا بادشاہ مسولینی کا معتقد نہیں بلکہ محض اس کی پارٹی کے اثر سے مجبور ہے، اور وہاں بادشاہ خود حضرت یوسف کا مرید ہو چکا تھا)۔ حضرت یوسف کے اس اقتدار کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے کہ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ "اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا، وہ اس کے جس حصہ کو چاہتا اپنی جگہ بنا سکتا تھا" یعنی پورا ملک اس کے قابو میں تھا۔ پھر اس کی مزید شہادت سورہ مائدہ میں ملتی ہے جہاں حضرت موسیٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ "اے قوم! یاد کرو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا کہ تم میں انبیاء پیدا کیے تھے، تم کو حکمراں قوم بنایا تھا اور تمھیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کو مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا تھا اس کی وجہ سے وہاں آخر کار مکمل انقلاب رونما ہوا، فراعنہ کے بجائے بنی اسرائیل حکمراں ہوئے اور ان کو وہ عروج نصیب ہوا جو ان کی ہمسر قوموں میں کسی کو حاصل نہ تھا۔ پھر جو مذہبی اثر حضرت یوسف نے مصر میں چھوڑا اس کی شہادت سورہ مومن سے ملتی ہے جس میں حضرت موسیٰ کے ہمعصر فرعون کو خطاب کر کے قبطی قوم کا ایک صاحبِ ایمان شخص کہتا ہے وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ رَسُولًا "تمھارے پاس یوسف روشن نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر پہلے تو تم اس چیز کی طرف سے شک میں رہے جسے وہ لائے تھے اور جب وہ انتقال فرما گئے تو تم نے کہا اب اللہ کوئی رسول نہ بھیجے گا"

یعنی اس پایہ کا شخص اب نہیں آسکتا۔

---

حضرت یوسف کے معاملہ کی یہ حقیقت جاننے کے بعد کون اس سے یہ استدلال کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت کا پرزہ بننا برحق ہے کیونکہ ایک نبی برحق ایسا کرچکا ہے۔ رہی آیت مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ جس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام فرعونی قوانین کی پابندی کرتے تھے، تو اگرچہ اس آیت کے معنی و مفہوم میں بہت کچھ کلام کی گنجائش ہے لیکن اس کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے اگر اسی کو تسلیم کرلیا جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ حضرت یوسف کے دورِ حکومت میں جس موقعہ پر یہ معاملہ پیش آیا (اور قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور ہی کا واقعہ تھا کیونکہ آنجناب کے عزیزِ مصر ہونے کے چند ہی سال بعد وہ مشہور ہفت سالہ قحط شروع ہوا جس میں آپ کے بھائیوں کو غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آنا پڑا تھا) اس وقت تک مصر میں فوجداری قانون وہی رائج تھا جو پہلے سے چلا آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک ملک کے نظامِ تمدن کو آنِ واحد میں نہیں بدلا جاسکتا۔ یہ کام بہرحال تدریج ہی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی عرب کے نظامِ تمدن کو بدلتے بدلتے دس سال لگ گئے تھے۔ وراثت کا قانون ۳ھ یا ۴ھ ہجری میں بدلا گیا، نکاح و طلاق کے قوانین ہجرت کے بعد پانچ چھ سال میں مکمل طور پر نافذ کیے گئے، فوجداری قوانین کی تکمیل میں پورے آٹھ سال لگ گئے، ملک کا معاشی نظام بتدریج ۹ سال میں بدلا گیا، شراب کا قطعی انسداد ۸ھ میں ہوا اور سود کی کلی ممانعت ۹ھ میں کی گئی۔ اسی طرح اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ملک کے قوانین بدلنے میں تدریج سے کام لیا ہو اور ایک خاص وقت تک ان کے زمانہ حکومت میں سابق قوانین جاری رہے ہوں تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ایک پیغمبرِ خدا کے سوا دوسروں کے جاہلی قوانین کو جائز سمجھ کر ان کی پابندی کرتا تھا؟

---

رہی تیسری دلیل تو اسے دراصل دلیل کے بجائے عذر کہنا چاہیے۔ اس عذر کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں اور یہاں صرف ایک حدیث سنانے پر اکتفا کرتے ہیں جسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| والجہاد ماض منذ بعثنی اللہ الی ان یقاتل اٰخر ھذہ الامۃ الدجال لا یبطلہ جور جائر ولا عدل عادل | اور جہاد میری بعثت کے وقت سے اس وقت تک جاری رہنا ہے جبکہ اس امت کا آخری گروہ دجال سے جنگ کریگا۔ نہ کسی ظالم کا ظلم اسے باطل کرسکتا ہے اور نہ کسی عادل کا عدل |

(یعنی نہ اُسے اس عذر کی بنا پر روکا جاسکتا ہے کہ اس وقت بڑے جابر ہم پر مسلط ہیں، نہ اس بات کو بہانہ بنایا جاسکتا ہے کہ حکومت اگرچہ کفار کی ہے مگر ہم کو امن نصیب ہے اور ہمارے ساتھ انصاف ہو رہا ہے، اور نہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ اگر ان کے اپنے ملک میں عدل کا دور دورہ ہو تو وہ مطمئن ہوکر بیٹھ رہیں اور باہر کی دنیا میں جو ظلم و فساد برپا ہو اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں)

# تفہیم القرآن

(۶)

## آل عمران

(از رکوع ۱ تا رکوع ۹)

اس سورۃ میں ایک مقام پر"آل عمران"کا ذکر آیا ہے۔اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

اس میں چار تقریریں شامل ہیں۔پہلی تقریر آغاز سورۃ سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے اور وہ غالباً جنگ بدر کے بعد قریبی زمانہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (اللہ نے آدم اور نوح اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیئے منتخب کیا تھا) سے لے کر چھٹے رکوع کے اختتام تک ۹ھ میں وفد نجران کے موقع پر نازل ہوئی۔ تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے۔چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختم سورۃ تک جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ان مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے وہ مقصد و مدعا اور مرکزی مضمون کی یکسانیت ہے۔سورۃ کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے۔ایک اہل کتاب (یہود و نصاریٰ)، دوسرے وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۃ بقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ان کی اعتقادی

گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بلا رہا ہے جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاء دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرۃ اللہ کے مطابق ایک ہی دین حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستہ سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں وہ خود اُن کتابوں کی رو سے بھی صحیح نہیں ہیں جن کو تم کتبِ آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کرسکتے۔ دوسرے گروہ کو، جو اب بہترین امت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جاچکا ہے، اُسی سلسلہ میں مزید ہدایات دی گئی ہیں جو سورۂ بقرہ میں شروع ہوا تھا۔ انھیں پچھلے انبیاء کی امتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان راہوں پر چلنے سے بچیں، انھیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہلِ کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے ہیں، اور انھیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر متوجہ کیا گیا ہے جن کا ظہور جنگِ اُحد کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ اس طرح یہ سورۃ نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزاء میں مسلسل و مربوط ہے بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مقام بقرہ سے متصل ہی ہے۔

سورۃ کا تاریخی پس منظر یہ ہے:

(۱) سورۂ بقرہ میں اِس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمائشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت متنبہ کر دیا گیا تھا وہ پوری شدت کے ساتھ پیش آچکی تھیں جنگ بدر میں اگرچہ اہلِ ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی لیکن یہ جنگ گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے کی ہم معنی تھی۔ اس اولین مسلح مقابلہ نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی،

اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینہ کی یہ چھوٹی سی بستی جس نے گرد و پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی تھی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ اِن حالات کا مدینہ کی معاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اول تو ایک چھوٹے سے قصبہ میں جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی، یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آجانے سے ہی معاشی توازن بگڑ چکا تھا، اس پر مزید مصیبت اِس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہوگئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، اِن لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کھلم کھلا قریش اور دوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلا دلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اِس سلسلہ میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ اِن یہودیوں کے ہمسایگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آرہے تھے ان کا پاس و لحاظ بھی انھوں نے اٹھا دیا تھا۔ آخر کار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گذر گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند مہینے بعد بنی قَینُقاع پر، جو اِن یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر تھا، حملہ کر دیا اور اُنھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی، انھوں نے مدینہ کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابۂ کرام اس زمانہ میں بالعموم ہتھیار بند سوتے تھے، شبخون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نگاہوں سے

اوجھل ہو جاتے تو صحابہ کرام گھبرا کر آپ کی ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چھڑکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکہ سے تین ہزار کا لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہو گیا اور اُحد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی جو جنگِ اُحد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینہ سے نکلے تھے مگر راستہ میں سے تین سو منافق یکایک الگ ہو کر مدینہ کی طرف پلٹ گئے اور جو سات سو آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی جس نے دورانِ جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مار آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیر و کا ایک بڑا حصہ تھا لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا، اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی جس کی اخلاقی تربیت ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس کی پوری سرگذشت پر ایک مفصل تبصرہ کیا جائے اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں ان میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے جو دنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

---

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

ا، ل، م۔ اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اُس نے تم پر[۱] یہ کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے[۲] اور اُن کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اِس سے پہلے اُس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے توراۃ اور انجیل نازل کی تھیں۔ نیز حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز بھی اس نے نازل فرمائی۔ اب جو لوگ اُس کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں[۳]، وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے[۴]۔ اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا

---

۱ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

۲ یعنی یہ کتاب سراسر علمِ حق پر مشتمل ہے۔ اس میں باطل اور جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں ہے، اس کے بیانات میں سے کوئی چیز قیاس اور گمان اور اندازے پر مبنی نہیں ہے، اس میں کہیں نظر و رائے اور فیصلہ کی غلطی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، ہر معاملہ میں یہ جو کچھ کہتی ہے حق ہی کہتی ہے۔

۳ یعنی وہ کائنات کی تمام حقیقتوں کا جاننے والا ہے، لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہو وہ سراسر حق ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ خالص حق صرف اُسی کتاب میں انسان کو میسر آسکتا ہے جو اس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔

۴ اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ تمھاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے نہ تم خود جان سکتے ہو، لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کیے بغیر تمھارے لیے چارہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس نے تمھارے استقرارِ حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمھاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہ دنیا کی زندگی میں تمھاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو تو وہ یہی ہے۔

نہیں ہے۔ وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں[۵۱]، اور دوسری متشابہات[۵۲]۔ جن لوگوں کے دلوں

۵۱ محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ "آیاتِ محکمات" سے مراد وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنی و مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں، جنھیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات "کتاب کی اصل بنیاد ہیں"، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ انہی میں اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے، انھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، انھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے، انہی میں دین کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں، انہی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بجھانے کے لیے آیاتِ محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرۃً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

۵۲ متشابہات = وہ جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے ــ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا جب تک کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس میں انسان کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے بنیادی امور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں نہ آسکتی ہیں، جن کو نہ اس نے کبھی دیکھا نہ چھوا نہ چکھا، اُن کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انہی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان مل سکتے ہیں جن سے ہر سامع کے ذہن میں اُن کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کیے جائیں جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن میں ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے، اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں یہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں ٹیڑھ ہے وہ فتنہ کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ اُن کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں[۱]"، اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ اہلِ ایمان اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ "مالک! جبکہ تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے تو اب کہیں ہمارے دلوں کو پھر کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، تو ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے"۔ ع ۱

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے انھیں اللہ کے مقابلہ میں نہ مال کچھ کام دیگا

(بقیہ صفحہ سابق) تک پہنچا دے یا اس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے، ورنہ اس کے مفہوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی اتنے ہی زیادہ اشتباہات واحتمالات سے سابقہ پیش آئے گا حتی کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اُس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بوالفضول یا فتنہ جو ہوتے ہیں ان کا تمام تر شغلہ متشابہات ہی کی بحث وتنقیب ہوتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم جانتے ہی نہیں تو ان پر ایمان کیسے لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے۔ اور جب آیات محکمات میں غور وفکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خلجان پیدا نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کا سیدھا سادہ مفہوم اس کی سمجھ میں آجاتا ہے اس کو وہ لے لیتا ہے، اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے وہاں کھوج لگانے اور موشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مجمل ایمان لا کر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

نہ اولاد، وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ اُن کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون کے ساتھیوں
اور اُن سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ
نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس جن لوگوں نے
تمہاری[1] دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اُن سے کہدو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم
مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور جہنم بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمہارے[2] لیے اُن
دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک
گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر
گروہ مومن گروہ سے دو چند ہے۔ مگر (نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا
ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے[3]۔

---

[1] خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

[2] یہ خطاب عام منکرین سے ہے جن میں اہلِ کتاب، مشرکینِ عرب اور منافقین سب شامل ہیں۔

[3] جنگِ بدر کا واقعہ اُس وقت قریبی زمانہ ہی میں پیش آچکا تھا اس لیے اس کے مشاہدات و نتائج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اس جنگ میں تین باتیں نہایت سبق آموز تھیں:۔

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے اس سے دونوں کا اخلاقی فرق صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دَور چل رہے تھے، ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں، اور خوب دادِ عیش دی جا رہی تھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں پرہیزگاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجہ کا اخلاقی انضباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے، بات بات پر خدا کا نام تھا اور خدا ہی کے آگے دعائیں اور التجائیں تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود کفار کی بڑی اور بہتر اسلحہ رکھنے والی

(باقی اگلے صفحہ پر)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں، حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو، میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہو گی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی، اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویّہ پر گہری نظر رکھتا ہے[۱۵]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ "مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچا لے"۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں[۱۶]، راستباز، فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے[۱۷]، اور فرشتے

---

(بقیہ صفحہ سابق) فوج کے مقابلہ میں جس طرح کامیاب ہوئے اس سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ ان کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی غالب طاقت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سر و سامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پھولے ہوئے تھے ان کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلاّش غریب الوطن مہاجروں اور مدینہ کے کاشتکاروں کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ذریعہ سے قریش جیسے قبیلہ کو شکست دلوا سکتا ہے جو تمام عرب کا سرتاج تھا۔

---

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۵؎ یعنی اللہ غلط بخش نہیں ہے، نہ سرسری اور سطحی طور پر فیصلہ کرنے والا ہے، بلکہ بندوں کے اعمال و افعال اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو خوب جانتا ہے اور اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں میں سے کون اِس انعام کا واقعی مستحق ہے۔

۱۶؎ یعنی راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں، کسی نقصان یا مصیبت سے ہمت نہیں ہارتے، کسی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں[۱] کہ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے[۲]۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے جنھیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرزِ عمل

(بقیہ صفحہ سابق) ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتے، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتے، اور ایسی حالت میں بھی حق کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں جبکہ بظاہر اُس حق کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔

[۱] یعنی اللہ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اُس کی شہادت ہے ـــ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی ـــ کہ پورے عالمِ وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو الوہیت کی صفات سے متصف ہو، الوہیت کے اقتدار کی مالک ہو، اور الوہیت کے حقوق کی مستحق ہو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے کیونکہ وہ سلطنتِ کائنات کے انتظامی اہلکار ہیں، اور وہ براہِ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رجوع کرتے ہوں۔ اس کے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہوا ہے اُن سب کی ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ متفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا مالک و مدبّر ہے۔

[۲] یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و درست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کردے، اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود ایجاد کرے بلکہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے، ہر کمی و بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیت کے لیے اسلام کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریت سے لے کر شرک و بت پرستی تک ہر نظریے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حقدار سمجھ سکتا ہے، مگر فرمانروائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے۔

کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔[۱] اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کردے اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو ان سے کہو "میں نے اور میرے پیرووں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے"۔ پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو "کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟"[۲] اگر کی تو وہ راہِ راست پا گئے، اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملہ کو دیکھنے والا ہے۔

ع ۲

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔[۳] یہ وہ لوگ ہیں جن کے

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوع انسانی میں رائج کیے گئے ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیازات حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اصول اور احکام میں رد و بدل کر ڈالا۔

[۲] دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ "میں اور میرے پیرو تو اس ٹھیٹھ اسلام کے قائل ہیں جو خدا کا اصل دین ہے۔ اب تم بتاؤ کہ آیا تم اپنے اور اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو؟"

[۳] یہ طنزیہ انداز بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں انھیں بتا دو کہ تمھارے ان اعمال کا انجام یہ ہے۔

اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہوگئے[۵۱] اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے۔

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے اُن کا حال کیا ہے؟ اُنھیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے[۵۲] تو اُن میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اِس فیصلہ کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز[۵۳]۔ اُن کے خود ساختہ عقیدوں نے اُن کو اپنے دین کے معاملہ میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی اُن پر جب ہم انھیں اُس روز جمع کریں گے

۵۱ "اُن کے اعمال ضائع ہوگئے" یعنی ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا، انھوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صرف کر دیں جس کا نتیجہ دنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔ "اور ان کا کوئی مددگار نہیں" یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان کی اس غلط سعی و عمل کو پھل بنا سکے، یا کم از کم بدانجامی ہی سے بچا سکے۔ جن جن قوتوں پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کے کام آئیں گی ان میں سے فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی۔

۵۲ یعنی اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کو آخری سند مان لو، اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دو، اور جو کچھ اُس کی رو سے حق ثابت ہو اُسے حق اور جو اس کی رو سے باطل ثابت ہو اُسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد توراۃ یا انجیل ہے اور "کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ پانے والوں" سے مراد یہود و نصاریٰ کے علما ہیں۔

۵۳ یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں، یا اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال جنت ہماری ہے، ہم اہلِ ایمان ہیں، ہم فلاں کی اُمت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے، اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، پھر سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کھلم کھلا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔

جس کا آنا یقینی ہے! اُس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو، اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔[له]

مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہمساز ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ،[۵۲] مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اُسی کی طرف پلٹ کر

---

له جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتوت دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پھل پھول رہے ہیں، ایک طرف اہلِ ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور دوسری طرف ان کو اس فقر و فاقہ اور ان مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام سنہ ۳ھ اور اس کے لگ بھگ زمانہ میں مبتلا تھے، تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز استفہام گردش کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اُسی استفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرایہ میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۵۲ یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہو اور اُسے اُن کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اسکو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انہی میں کا ایک آدمی ہے، یا اگر اس کا مسلمان ہونا ظاہر ہوگیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رویہ کا اظہار بھی کر سکتا ہے حتیٰ کہ شدید خوف کی حالت میں، جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

جانتا ہے[۱] ۔ اے نبی، لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے اُسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہرحال اُسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا بُرائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اُس سے بہت دور ہوتا! اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے[۲] ۔ ع۳

اے نبی، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اُن سے کہو کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو"۔ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور

---

[۱] یعنی کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمھاری دنیا بگاڑ سکتے ہیں مگر خدا تمھیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بس اِس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تمھاری جان و مال کا تحفظ ہو جائے اور کفر یا کافروں کی کوئی حقیقی خدمت تمھارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلہ میں کفر کو فروغ حاصل ہونے کا امکان ہو۔ ورنہ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو یا اہلِ ایمان کی جماعت کو یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا، یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی تو اللہ کے محاسبے سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ جانا تم کو بہرحال اُسی کے پاس ہے۔

[۲] یعنی یہ اس کی انتہائی خیر خواہی ہے کہ وہ تمھیں قبل از وقت ایسے اعمال پر متنبہ کر رہا ہے جو تمھارے انجام کی خرابی کے موجب ہو سکتے ہیں۔

اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں[29]۔

اللہ[30] نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران[31] کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلہ کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[32]۔ (وہ اس وقت سن رہا تھا) جب عمران کی

---

[29] یہاں پہلی تقریر ختم ہوتی ہے۔ اس کے مضمون، خصوصاً جنگِ بدر کی طرف جو اشارہ اس میں کیا گیا ہے اس کے انداز پر غور کرنے سے غالب قیاس یہی ہوتا ہے کہ اس تقریر کے نزول کا زمانہ جنگِ بدر کے بعد اور جنگِ اُحد سے پہلے کا ہے، یعنی سنہ ۳ ہجری۔ محمد بن اسحاق کی روایت سے عموماً لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس سورۃ کی ابتدائی ۸۰ آیتیں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر سنہ ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن اول تو اِس تمہیدی تقریر کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ اس سے بہت پہلے نازل ہوئی ہوگی۔ دوسرے مقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نجران کی آمد پر صرف وہ آیات نازل ہوئی ہیں جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بیان پر مشتمل ہیں اور جن کی تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔

[30] یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے جس کے نزول کا زمانہ سنہ ۹ ہجری ہے جب کہ نجران کی عیسائی جمہوریت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اُس وقت اس علاقہ میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی، ایک عاقب کہلاتا تھا جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی، دوسرا سید کہلاتا تھا جو ان کے تمدنی و سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا، اور تیسرا اسقف تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں نجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینہ پہنچے۔ جنگ کے لیے بہرحال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذِمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا تا کہ اس کے ذریعہ سے وفدِ نجران کو اسلام کی طرف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

عورت[۱۱] کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا، میری اس پیش کش کو قبول فرما، تو سننے اور جاننے والا ہے[۱۲]۔ پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا "مالک، میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے"۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو اس کی خبر تھی ۔ "اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا[۱۳]۔ خیر، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں"۔ آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرمالیا، اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا، اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنا دیا۔

(بقیہ سابق) دعوت دی جائے۔

۱۰؎ حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا اور آل عمران سے مراد وہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو حضرت موسیٰ و ہارون سے لے کر حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ تک پیدا ہوئے۔

۱۱؎ مسیحیوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ مسیح کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور الوہیت میں اُس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بنیادی غلطی رفع ہو جائے تو اسلام صحیح و خالص کی طرف ان کا پلٹنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر خطبہ کی تمہید یوں اُٹھائی گئی ہے کہ آدم اور نوح اور نسل عمرانی کے سب پیغمبر انسان تھے، ایک کی نسل سے دوسرا پیدا ہوتا چلا آیا، ان میں سے کوئی الٰہ نہ تھا، بس ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ نے اپنے دین کی تبلیغ اور دنیا کی اصلاح کے لیے ان کو منتخب فرمایا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۲؎ اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریم کے والد تھے اور ان کا نام بھی عمران تھا۔ اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے تو دونوں جگہ عمران سے دو الگ شخصیتیں مراد لینے کی ضرورت نہ رہے گی لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعۂ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر دونوں معنوں میں سے ایک کو ترجیح دے سکیں کیونکہ اس کا انحصار یہ ثابت ہو جانے پر ہے کہ حضرت مریم کے والد کا نام واقعی عمران تھا، یا نہیں تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب[1] میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر زکریا[2] نے اپنے رب سے پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر، تو ہی دعا سننے والا ہے"۔ جواب میں فرشتوں نے آواز دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان[3] کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا، اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی،

(بقیہ سابق) یعنی تو اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی نیتوں کے حال سے واقف ہے۔

یعنی لڑکا ان بہت سی فطری کمزوریوں اور تمدنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو وہ مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] اب اُس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریمؑ سنِ رشد کو پہنچ گئیں اور بیت المقدس کی عبادتگاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔

لفظ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اُس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اہلِ عبادتگاہ کی عمارت سے متصل سطحِ زمین سے کافی بلندی پر حجرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔

[2] حضرت زکریا اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرۃً ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش اللہ انھیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کرے، اور یہ دیکھ کر کہ اللہ کس طرح اپنی قدرت سے اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق پہنچا رہا ہے انھیں یہ امید ہوئی کہ اللہ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی اُن کو اولاد دے سکتا ہے

[3] اللہ کے فرمان سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش (باقی اگلے صفحہ پر)

کمال درجہ کا ضابط ہوگا، نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا"۔ زکریّا نے کہا "پروردگار بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے"۔ جواب ملا "ایسا ہی ہوگا،[۱] اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ عرض کیا "مالک! پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے"[۲]۔ کہا "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا"[۳]۔ ع ۴

پھر وہ وقت آیا جب مریم سے فرشتوں نے آکر کہا "اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریم اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک"۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے

(بقیہ سابق) اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرق عادت کے طور پر ہوئی تھی اس لیے ان کو قرآن مجید میں "کلمۃ من اللہ" کہا گیا ہے۔

---

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی تیرے بڑھاپے اور تیرے بانجھ پن کے باوجود اللہ تجھے بیٹا دے گا۔

[۲] یعنی ایسی علامت بتا دے کہ جب ایک پیر فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اطلاع مجھے پہلے سے ہو جائے۔

[۳] اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر ان کے اس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ بیچ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام کی ولادت معجزانہ طریقہ سے ہوئی تھی اسی طرح اُن سے چھ مہینہ پہلے ہی حضرت یحییٰ کی پیدائش بھی ایک دوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی۔ اس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحییٰ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیح محض اپنی غیر معمولی پیدائش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے، اور نہ تم اُس وقت حاضر تھے جب اُن کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔ اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابنِ مریم ہوگا، دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مرد صالح ہوگا"۔ یہ سُن کر مریم بولی "پروردگار! میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا"۔ جواب ملا "ایسا ہی ہوگا[1]، اللہ

---

[1] یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کذالک (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریا کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنی کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریم کے ہاں اُسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے اور اگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش فی الواقع اسی طرح ہوئی ہوتی تو یہ سارا بیان قطعی مہمل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے ہیں جو ولادت مسیح کے باب میں دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو الٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے مانا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی اور مسیحیوں نے حضرت مریم پر تہمت اسی وجہ سے لگائی تھی کہ علانیہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ ہے اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی ہو جاتا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اُسی کے نطفے سے عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دو ٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اُٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت (باقی اگلے صفحہ پر)

جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔" (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا) "اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، توراۃ اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔ (اور وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل سے کہے گا کہ) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر سکتا ہوں اور مُردے کو زندہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔[۵۱] اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں سے اِس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے[۵۲] اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو

---

(بقیہ صفحہ سابق) کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ و ماں کے اتّصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہارِ مافی الضمیر اور بیانِ مدعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں (معاذ اللہ)۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اُس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکمِ ذی اقتدار ہے، بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

[۵۲] یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور پر تمہیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا، لیکن میں تو اُسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔[۵۱] دیکھو، میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی اُس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔[۵۲]"

جب عیسیٰ نے محسوس کیا[۵۳] کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟" حواریوں[۵۴] نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں،[۵۵] ہم اللہ

---

۵۱؎ یعنی تمھارے جہلا کے توہمات، تمھارے فقیہوں کی قانونی موشگافیوں، تمھارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشددات، اور غیر مسلم قوموں کے غلبہ و تسلط سے تمھارے ہاں اصل شریعتِ الٰہی پر جن قیود کا اضافہ ہو گیا ہے ان کو منسوخ کر دوں اور تمھارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

۵۲؎ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے: ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کے خوف پر اخلاق و تمدن کا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس مقتدرِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔ پس درحقیقت حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ رعایا کو نافرمانی، خود مختاری اور شرک (یعنی اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھیرانے اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کرنے) سے منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

۵۳؎ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لے کر ان کے جوان ہونے اور نبوت کا کام عملاً شروع کر دینے تک کے تمام واقعات بیچ میں چھوڑ کر اب اس وقت کا ذکر شروع کیا جاتا ہے جب بنی اسرائیل میں اُن کی (باقی اگلے صفحہ پر)

پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے) ہیں، مالک! جو فرمان تونے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے، جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ (ع) (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) ع۵
جب اُس نے کہا کہ "اے عیسیٰ اب میں تجھے واپس لے لوں گا[۵۱] اور تجھ کو اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور

(بقیہ سابق) مخالفت شروع ہوئی۔

[۴۹] "حواری" کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں "انصار" کا مفہوم ہے۔

[۵۰] دینِ اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "اللہ کی مدد کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا بلکہ اسے دلیل اور نصیحت سے اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح ونجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی واطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے، اور جو بندے اس کام میں اللہ کے ساتھ شریک ہوں ان کو اللہ اپنا رفیق ومددگار قرار دیتا ہے، اور یہ وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ وغلام ہوتا ہے، مگر تبلیغ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت ومددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقاء کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۱] اصل میں لفظ "متوفیک" استعمال ہوا ہے۔ توفّی کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں۔ "روح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے نہ کہ اصل معنی موضوع لہ۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ To recall کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے (ان کی معیت سے اور ان کے گندے ماحول میں ان کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک اُن لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے

(بقیۂ سابق) صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور ہر اُس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انھیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقّاصہ کی فرمائش پر قربان کر دیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کی تردید و اصلاح کے لیے ہے، اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کا اہم ترین سبب حضرت مسیح کی اعجازی ولادت اور ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات کے بعد اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا ہے جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر عیسائیوں کی یہ روایت غلط ہوتی تو ان کے عقیدہ الوہیت کا اس سے بہتر کوئی رد نہ ہو سکتا تھا کہ ان سے صاف الفاظ میں کہا جاتا کہ جسے تم الٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فلاں مقام پر جا کر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور جنھوں نے ایمان اور نیک عملی کا رویّہ اختیار کیا ہے انھیں اُن کے اجر پورے پورے دیے جائیں گے۔ اور خوب جان لے کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اُسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا[۵۱]۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اِس میں شک کرتے ہیں[۵۲]۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اِس معاملہ میں تم سے

(بقیہ سابق) اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیح سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں ایلی ایلی لما شبقتانی کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا، مسیح کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اُٹھا لیا تھا۔ اس پر بھی جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

۵۰ انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انھوں نے اُسے رد کر دیا تھا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۱ یہاں تک کی تقریر میں جو بنیادی نکات عیسائیوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ علی الترتیب حسب ذیل ہے:

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمھارے اندر

(باقی اگلے صفحہ پر)

جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو"۔[له] یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظامِ عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اس شرط پر مقابلہ میں آنے سے) منہ موڑیں تو

---

(بقیہ سابق) جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھا لے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا ملکیت میں اُس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اُس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔

---

(حاشیہ صفحہ ہذا) له فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفدِ نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا جواب بھی اُن لوگوں کے پاس نہ تھا۔ اور مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے بھی قائل ہو چکے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے، اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو (باقی اگلے صفحہ پر)

ع (اُن کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔

کہو[۸۵] اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے[۸۶]، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے ــــ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں ــــ

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ توراۃ اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں، پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے[۸۷] ــــ تم لوگ جن

---

(بقیہ سابق) کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا اور یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۸۵] یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جس کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کے درمیانی دور کی ہے۔ لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سورۃ سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربطِ کلام ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر بعض مفسرین کو شبہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفدِ نجران والی تقریر ہی کے سلسلہ کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مخاطب یہودی ہیں۔

[۸۶] یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمھارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے، تمھاری اپنی کتبِ مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

[۸۷] یعنی تمھاری یہ یہودیت اور یہ نصرانیت بہرحال توراۃ اور انجیل کے نزول کے بعد پیدا ہوئی ہیں اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب اُن معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ سیدھا[1] مسلم تھا اور شرک کرنے والوں میں ہرگز نہ تھا"۔ ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اُس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اِس کے ماننے والے اِس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔

(اے ایمان لانے والو!) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمھیں راہِ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو[2]؟ اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟

---

(بقیہ سابق) ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گذر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے وہ بہرحال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا، پھر اگر حضرت ابراہیم راہِ راست پر تھے اور نجات یافتہ تھے تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہِ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیت و نصرانیت کی پیروی پر موقوف نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اصل میں لفظ حنیف استعمال ہوا ہے جس سے مراد ایسا شخص ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر یکسوئی کے ساتھ سیدھی راہ پر چلے۔

[2] دوسرا ترجمہ اس فقرہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم خود گواہی دیتے ہو"۔ دونوں صورتوں میں نفس معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابۂ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات، اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہوتے تھے، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو گروہ انبیاء کے احوال اور کتبِ آسمانی کے طرز سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرت کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟

اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کردو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔[1] نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔ اے نبی ان سے کہدو کہ "اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اُسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دیدیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا، یا یہ کہ دوسروں کو تمہارے رب کے حضور پیش کرنے کے لیے تمہارے خلاف قوی حجت مل جائے"۔ اے نبی ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر[2] ہے اور سب کچھ جانتا ہے،[3] اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کرلیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے"۔

(بقیہ سابق) نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل تھا چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہل کتاب (خصوصاً ان کے اہلِ علم) پہچان چکے تھے کہ حضور وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیاء سابقین نے کیا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپ کی صداقت اور آپ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کر گزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودی قبائل کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کرکے بھیجنا شروع کیا تاکہ پہلے علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور اُن کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں۔

[2] اصل میں لفظ "واسع" استعمال ہوا ہے جو بالعموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقع جہاں

(باقی اگلے صفحہ پر)

اہلِ کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمھارا مال تمھیں ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ اُن کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "امیوں (غیر یہودی عربوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے[۵۵]"۔ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں اُن سے بازپرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ اُن سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا[۵۶]، بلکہ اُن

(بقیہ سابق) انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اُسے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمھاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمھاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیت منسوب کرتے ہیں اور انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔

۵۴ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کون فضل و شرف کا مستحق ہے۔

---

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۵ یعنی امانت اور دیانت کا لحاظ صرف یہودیوں سے معاملہ کرنے میں ہونا چاہیے، غیر یہودی کا مال اگر مار لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ عجب نہیں کہ کارِ ثواب ہو۔

۵۶ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اخلاقی جرائم کر لینے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز بس یہی اللہ کے مقرب بندے ہوں گے، انہی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی، جو تھوڑا بہت

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔[1] وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی[2] بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا

(بقیہ سابق) گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھوڈالا جائیگا حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب الہٰی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو اُن کے مفاد یا اُن کے خودساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب میں بھی مفقود نہیں ہیں، مثلاً بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں اِنَّمَا کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "اے نبی کہدو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا"۔

[2] یہودیوں کے ہاں جو علماء مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی امور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکام دین کا اجراء کرنا ہوتا تھا، ان کے لیے لفظ ربانی استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ خود قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ

(باقی اگلے صفحہ پر)

۸۱ حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟ [80]

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔[70] یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اُٹھاتے ہو؟" انھوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، اِس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔[71]"

(بقیہ حاشیہ سابق) اَكْلِهِمُ السُّحْتَ (ان کے ربانی اور ان کے علما ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے) اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (Divine) بھی "ربانی" کا ہی ہم معنی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۲۹ یہ اُن تمام غلط باتوں کی ایک جامع تردید ہے جو دنیا کی مختلف قوموں نے خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی رو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبود قرار پاتا ہے۔ ان آیات میں یہ قاعدہ کلیہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

۷۰ مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ــــ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ اس کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ــــ کہ جو نبی ہماری طرف سے اس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمھیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصب

(باقی اگلے صفحہ پر)

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اُسی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں[۵] اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبی کہو کہ "ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں، اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے[۶] اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں"۔ اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

---

(بقیہ سابق) نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مخالفت نہ کرنا، بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

[۵] اس ارشاد سے مقصود اہلِ کتاب کو متنبہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور ان کی مخالفت کر کے اس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمہارے انبیاء سے لیا گیا تھا، لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

---

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کونسا طریقۂ زندگی (باقی صفحہ آئندہ پر)

کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول حق پر ہے اور روشن نشانیاں لیکر آیا ہے[۵۹]؟ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ اُن پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے، اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔ البتہ وہ لوگ اس سے بچ جائیں گے جو توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے اس کفر میں بڑھتے چلے گئے[۶۰] ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے رُوئے زمین بھر کر بھی سونا فدیہ میں دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ ع۹

---

(بقیہ سابق) تلاش کر رہے ہو۔

۵۸ یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، کسی کو جھوٹا کہیں اور کسی کو سچا۔ ہم تعصب اور حمیتِ جاہلیہ سے پاک ہیں۔ دنیا میں جہاں جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ہم اس کے برحق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔

---

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۹ یہاں پھر اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے قبل بارہا بیان کی جا چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کے یہودی علماء جان چکے تھے اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپ نبی برحق ہیں اور جو تعلیم آپ لائے ہیں وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا وہ محض تعصب، ضد اور دشمنیِ حق کی اس پرانی عادت کا نتیجہ تھا جس کے وہ صدیوں سے مجرم چلے آرہے تھے۔

۶۰ یعنی صرف انکار ہی پر بس نہ کی بلکہ عملاً مخالفت و مزاحمت بھی کی، لوگوں کو خدا کے راستہ سے روکنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں، دلوں میں وسوسے ڈالے، اور ایسی سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں کہ نبی کا مشن کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔

## مقالات

# اسلام میں مُرتد کا حُکم

## کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغِ کفر کی اجازت ہے؟

"کیا اسلام نے مرتد کی سزا قتل قرار دی ہے؟ قرآن سے اس کا کیا ثبوت ملتا ہے؟ اگر قرآن سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے تو احادیث و سنت سے کہاں تک اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے؟ نیز حضرت ابوبکرؓ کے قتالِ مرتدین کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ عقلی حیثیت سے قتلِ مرتدین کا جواز کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟

کیا ایک صحیح اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلموں کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق اسی طرح حاصل ہوگا جس طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہیے؟ کیا خلافتِ راشدہ اور بعدی خلافتوں کے تحت کفار و اہلِ کتاب کو اپنے مذاہب کی تبلیغ کا حق حاصل تھا؟ قرآن و سنت اور عقلی حیثیت سے اس کے عدمِ جواز کا کہاں تک ثبوت ملتا ہے؟

ان دونوں امور کے متعلق میں نے بہت غور کیا مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ خلاف اور موافق دونوں دلائل وزن رکھتے ہیں اور قرآن و سنت میں ان امور کی بابت کوئی خاص تصریح نہیں ملتی، کم از کم جہاں تک میرا محدود علم رسائی کرتا ہے۔ اگر اس کا جواب ترجمان القرآن میں شائع ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ میرے سوا بہت سے لوگ اس بحث سے دلچسپی رکھتے ہیں۔"

یہ ایک دوست کے خط کا اقتباس ہے جنھیں اسلام کے نظامِ تمدن و سیاست سے خاص دلچسپی ہے اور اکثر اس سلسلہ میں مسائل کی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔

ان سوالات میں تنقیح طلب امور صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ قتلِ مرتد اور کفار کی تبلیغ کے باب میں اسلام کے واقعی احکام کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس کیا دلائل ہیں جن سے ہم ان احکام کی معقولیت پر خود مطمئن ہیں اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔

۱۔ مسئلۂ قتلِ مرتد شرعی حیثیت سے | جہاں تک پہلی تنقیح کا تعلق ہے، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ اسلام میں ایسے شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ اس باب میں پہلا شک جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی عیسوی کے دورِ آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا، ورنہ اس سے پہلے کامل بارہ سو برس تک یہ تمام امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے اور ہمارا پورا دینی لٹریچر شاہد ہے کہ قتلِ مرتد کے معاملہ میں مسلمانوں کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں پائی گئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابۂ کبار، تابعین، ائمہ مجتہدین، اور ان کے بعد ہر صدی کے علمائے شریعت کی تصریحات کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے دیکھ لیجیے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ دورِ نبوت سے لے کر آج تک اس مسئلہ میں ایک ہی حکم مسلسل و متواتر چلا آ رہا ہے اور کہیں اس شبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی کہ شاید مرتد کی سزا قتل نہ ہو۔ ایسے ثابت شدہ مسائل کے متعلق جن لوگوں نے موجودہ زمانہ کی نام نہاد روشن خیالی سے متاثر ہو کر اختلافی بحث کا دروازہ کھولا اُن کی جسارت فی الواقع سخت حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر ایسے امور بھی مشکوک ہو جائیں جن کے لیے اس قدر تسلسل اور تواتر کے ساتھ شہادتیں پائی جاتی ہیں تو معاملہ ایک دو مسائل تک محدود کہاں رہتا ہے۔ اس کے بعد تو زمانۂ گذشتہ کی کوئی چیز بھی جو ہم تک روایۃً پہنچی ہے شک سے محفوظ نہیں رہتی، خواہ وہ قرآن ہو یا نماز یا روزہ، بلکہ سرے سے یہی بات مشکوک ہو جاتی ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی دنیا میں مبعوث بھی ہوئے تھے یا نہیں۔ اس قسم کے شکوک پیدا کرنے کے بجائے درحقیقت اُن کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ واقعہ ہے اور مستند شہادتوں

سے ثابت ہے اسے واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے اور پھر غور اس امر پر کرتے کہ آیا ہم اُس دین کا اتباع کریں یا نہ کریں جو مرتد کو موت کی سزا دیتا ہے۔ اپنے مذہب کی کسی ثابت و مسلّم چیز کو اپنے عقلی معیاروں کے خلاف پا کر جو شخص یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ چیز اس مذہب میں سے ہے ہی نہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ "کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو" کی حالت میں مبتلا ہے۔ یعنی اس کا طریقِ فکر و نظر جس مذہب کے حقیقی راستہ سے منحرف ہو چکا ہے، اس میں رہنے پر وہ صرف اس لیے اصرار کر رہا ہے کہ وہ مذہب اس نے باپ دادا سے پایا ہے۔

**حکمِ قتلِ مرتد کا ثبوت** ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو اور بعد کے مولویوں نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو ان کو اطمینان دلانے کے لیے میں یہاں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| من بدل دینہ فاقتلوہ | جو شخص (یعنی مسلمان) اپنا دین بدل دے اُسے قتل کر دو |

یہ حدیث حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت خالد بن ولید اور متعدد دوسرے صحابہ سے مروی ہے اور تمام معتبر کتب حدیث میں موجود ہے۔ اس کی مزید تائید حسب ذیل احادیث سے ہوتی ہے:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود روایت کرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل دم امرء مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلث: النفس بالنفس، والثیب الزانی، والمفارق لدینہ التارک للجماعۃ (بخاری، کتاب الدیات۔ مسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات) | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمان ہو اور اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون تین جرائم کے سوا کسی صورت میں حلال نہیں، ایک یہ کہ اس نے کسی کی جان لی ہو اور قصاص کا مستحق ہو گیا ہو، دوسرے یہ کہ وہ شادی شدہ ہو |

اور زنا کرے، تیسرے یہ کہ اپنے دین کو چھوڑ دے اور جماعت سے الگ ہو جائے۔

## ۲۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یحل دم امرء مسلم الا رجل زنی بعد احصانہ او کفر بعد اسلامہ او النفس بالنفس (نسائی۔ باب ذکر ما یحل بہ دم المسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں الا یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کی ہو، یا مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کیا ہو، یا کسی کی جان لی ہو۔

## ۳۔ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یحل دم امرء مسلم الا باحدی ثلث، رجل کفر بعد اسلامہ او زنی بعد احصانہ او قتل نفساً بغیر نفس (نسائی، باب الحکم)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے بجز تین صورتوں کے، ایک یہ کہ کوئی شخص اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا ہو، دوسرے یہ کہ شادی شدہ ہونے کے بعد اس نے زنا کی ہو تیسرے یہ کہ وہ قتل کا مرتکب ہو بغیر اس کے کہ اسے جان کے بدلے جان لینے کا حق حاصل ہوا ہو۔

## حضرت عثمانؓ ہی سے دوسری روایت یہ ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا یحل دم امرء مسلم الا باحدی ثلث رجل زنی بعد احصانہ فعلیہ الرجم او قتل عمداً فعلیہ القود او ارتد بعد اسلامہ فعلیہ القتل۔ (نسائی، باب الحکم فی المرتد)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین جرائم کی پاداش میں، ایک یہ کہ کسی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کی ہو، اس کی سزا سنگساری ہے، دوسرے یہ کہ کسی نے عمداً قتل کا ارتکاب کیا ہو، اس پر قصاص ہے، تیسرے یہ کہ کوئی اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا ہو، اس کی سزا قتل ہے۔

تاریخ کی تمام معتبر کتابوں سے ثابت ہے کہ یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوکر ہزاروں آدمیوں کے سامنے اس وقت بیان کی تھی جب کہ باغی آپ کے مکان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور آپ کے قتل کے درپے تھے۔ اگر یہ امر ذرہ برابر بھی مشتبہ ہوتا کہ آیا یہ فرمانِ نبوی ہے یا نہیں، تو سینکڑوں آوازیں بلند ہوجاتیں کہ آپ کا بیان غلط ہے یا مشکوک ہے۔

۴۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثہ الی الیمن ثم ارسل معاذ بن جبل بعد ذالک فلما قدم قال ایھا الناس انی رسول رسول اللہ الیکم فالقی لہ ابوموسیٰ وسادۃ لیجلس علیھا فاتی رجل کان یھودیا فاسلم ثم کفر فقال معاذ لا اجلس حتی یقتل قضاء اللہ ورسولہ ثلث مرات فلما قتل قعد (نسائی باب حکم المرتد۔ بخاری باب حکم المرتد والمرتد و استتابتھم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو (یعنی حضرت ابوموسیٰ کو) یمن کا حاکم مقرر کرکے بھیجا پھر اس کے بعد معاذ بن جبل کو ان کے معاون کی حیثیت سے روانہ کیا جب معاذ وہاں پہنچے تو انھوں نے اعلان کیا کہ لوگو! میں تمھاری طرف اللہ کے رسول کا فرستادہ ہوں۔ ابوموسیٰ نے ان کے لیے تکیہ رکھا تاکہ اس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں۔ اتنے میں ایک شخص پیش ہوا جو پہلے یہودی تھا پھر مسلمان ہوا پھر یہودی ہوگیا۔ معاذ نے کہا میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک یہ شخص قتل نہ کردیا جائے، اللہ اور اس کے رسول کا یہی فیصلہ ہے معاذ نے یہ بات تین دفعہ کہی۔ آخرکار جب وہ قتل کردیا گیا تو معاذ بیٹھ گئے۔

خیال رہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں پیش آیا۔ اس وقت حضرت ابوموسیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنر کی حیثیت میں اور حضرت معاذ والئی گورنر کی حیثیت میں تھے۔ اگر ان کا یہ فعل واقعی اللہ اور رسول کے فیصلہ پر مبنی نہ ہوتا تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پر

باز پرس فرماتے۔

**خلافتِ راشدہ کے نظائر** اس کے بعد دورِ خلافتِ راشدہ کے نظائر ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ایک عورت جس کا نام ام فرقہ تھا اسلام لانے کے بعد کافر ہوگئی۔ حضرت ابوبکر نے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا، مگر اس نے توبہ نہ کی۔ حضرت ابوبکر نے اسے قتل کرا دیا۔ (کنز العمال و نیل الاوطار)

(۲) عمرو ابن عاص حاکم مصر نے حضرت عمر کو لکھا کہ ایک شخص اسلام لایا تھا، پھر کافر ہوگیا، پھر اسلام لایا پھر کافر ہوگیا۔ یہ فعل وہ کئی مرتبہ کر چکا ہے۔ اب اس کا اسلام قبول کیا جائے یا نہیں۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ جب تک اللہ اس سے اسلام قبول کرتا ہے تم بھی کیے جاؤ۔ اس کے سامنے اسلام پیش کرو، مان لے تو چھوڑ دو ورنہ گردن مار دو (کنز العمال)

(۳) سعد بن ابی وقاص اور ابو موسیٰ اشعری نے تستر کی فتح کے بعد حضرت عمر کے پاس ایک قاصد بھیجا۔ قاصد نے حضرت عمر کے سامنے حالات کی رپورٹ پیش کی۔ آخر میں حضرت عمر نے پوچھا کوئی اور غیر معمولی بات؟ اس نے عرض کیا ہاں اے امیر المومنین! ہم نے ایک عرب کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہوگیا تھا۔ حضرت عمر نے پوچھا پھر تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا ہم نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر حضرت عمر نے کہا "تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ اسے ایک کمرے میں بند کر کے دروازہ کا تیغہ لگا دیتے، پھر تین دن تک روزانہ ایک روٹی اس کے پاس پھینکتے رہتے۔ شاید کہ وہ اس دوران میں توبہ کر لیتا۔ خدایا یہ کام میرے حکم سے نہیں ہوا، نہ میرے سامنے ہوا، نہ میں اسے سن کر راضی ہوا۔" لیکن حضرت عمر نے اس پر حضرت سعد اور ابو موسیٰ اشعری سے کوئی باز پرس نہیں کی اور نہ کوئی سزا تجویز کی (طحاوی، کتاب السیر، بحث استتابۃ المرتد)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعد اور ابو موسیٰ کا فعل تھا تو قانون کی حدود کے اندر لیکن

حضرت عمر کی رائے میں اس شخص کو توبہ کا موقع دینا احسن تھا۔

(۴) حضرت عبداللہ ابن مسعود کو اطلاع ملی کہ بنی حنیفہ کی ایک مسجد میں کچھ لوگ شہادت دے رہے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ نے پولیس بھیجی اور ان کو گرفتار کر کے بلا لیا۔ جب وہ لوگ ان کے سامنے پیش ہوئے تو سب نے توبہ کر لی اور اقرار کیا کہ ہم آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ نے اوروں کو تو چھوڑ دیا مگر ان میں سے ایک شخص عبداللہ ابن النواحہ کو موت کی سزا دی۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ نے ایک ہی مقدمہ میں دو مختلف فیصلے کیے۔ حضرت عبداللہ نے جواب دیا کہ یہ ابن النواحہ وہ شخص ہے جو مسیلمہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفیر بن کر آیا تھا۔ میں اس وقت حاضر تھا۔ ایک دوسرا شخص حجر بن وثال بھی اس کے ساتھ سفارت میں شریک تھا۔ آنحضرت نے ان دونوں سے پوچھا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ان دونوں نے جواب دیا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے؟ اس پر حضور نے فرمایا کہ اگر سفارتی وفد کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت عبداللہ نے کہا میں نے اسی وجہ سے ابن النواحہ کو سزائے موت دی ہے (طحاوی حوالہ مذکور)

واضح رہے کہ یہ واقعہ حضرت عمر کے زمانہ کا ہے جب کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود اُن کے ماتحت کوفہ کے چیف جج تھے۔

(۵) کوفہ میں چند آدمی پکڑے گئے جو مسیلمہ کی دعوت پھیلا رہے تھے۔ حضرت عثمان کو اس باب میں لکھا گیا۔ آپ نے جواب میں لکھا ان کے سامنے دینِ حق اور شہادتِ لاالٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ پیش کی جائے، جو اسے قبول کرے اور مسیلمہ سے برارت کا اظہار کر دے اُسے چھوڑ دیا جائے اور جو دینِ مسیلمہ پر قائم رہے اسے قتل کر دیا جائے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۶) حضرت علی کے سامنے ایک شخص پیش کیا گیا جو پہلے عیسائی تھا، پھر مسلمان ہوا، پھر عیسائی ہوگیا۔ آپ نے اس سے پوچھا تیری اس روش کا کیا سبب ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے عیسائیوں کے دین کو تمھارے دین سے بہتر پایا۔ حضرت علی نے پوچھا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمھارا کیا عقیدہ ہے؟ اس نے کہا وہ میرے رب ہیں، یا یہ کہا کہ وہ علی کے رب ہیں۔ اس پر حضرت علی نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۷) حضرت علی کو اطلاع دی گئی کہ ایک گروہ عیسائی سے مسلمان ہوا پھر عیسائی ہوگیا۔ حضرت علی نے ان لوگوں کو گرفتار کرا کے اپنے سامنے بلوایا اور حقیقتِ حال دریافت کی۔ انھوں نے کہا ہم عیسائی تھے، پھر ہمیں اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں، ہم نے اسلام کو اختیار کر لیا، مگر اب ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے سابق دین سے افضل کوئی دین نہیں ہے لہٰذا اب ہم عیسائی ہیں۔ اس پر حضرت علی کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنا لیے گئے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۸) حضرت علی کو اطلاع دی گئی کہ کچھ لوگ آپ کو اپنا رب قرار دیتے ہیں۔ آپ نے انھیں بلا کر پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا آپ ہمارے رب ہیں اور ہمارے خالق و رازق ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا، تمھاری حالت پر افسوس ہے، میں تو تم جیسا ایک بندہ ہوں، تمھاری طرح کھاتا اور پیتا ہوں، اگر اللہ کی اطاعت کروں گا تو وہ مجھے اجر دے گا اور اس کی نافرمانی کروں تو مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے سزا دے گا۔ لہٰذا تم خدا سے ڈرو اور اپنے اس عقیدہ کو چھوڑ دو۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ دوسرے دن قنبر نے آکر عرض کیا کہ وہ لوگ پھر وہی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ نے انھیں بلا کر دریافت کیا اور انھوں نے وہی سب باتیں دہرا دیں۔ تیسرے روز حضرت علی نے انھیں بلا کر دھمکی دی کہ اگر اب تم نے وہ بات کہی تو میں تم کو بدترین طریقہ سے قتل کروں گا

مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار حضرت علی نے ایک گڑھا کھدوایا، اس میں آگ جلوائی، پھر ان سے کہا، دیکھو اب بھی اپنے اس قول سے باز آجاؤ ورنہ میں تمھیں اس گڑھے میں پھینک دوں گا، مگر وہ اپنے اسی عقیدے پر قائم رہے۔ تب حضرت علی کے حکم سے وہ سب اس گڑھے میں پھینک دیے گئے (فتح الباری، جلد ۱۲، ص ۲۳۸)

(۹) حضرت علی رحبہ کے مقام پر تھے کہ آپ کو ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ یہاں ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں ایک بُت رکھ چھوڑا ہے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بُت نکل آیا۔ حضرت علی نے اس گھر میں آگ لگادی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا (فتح الباری جلد ۱۲، صفحہ ۲۳۹)

(۱۰) حضرت علی کے زمانہ میں ایک شخص پکڑا ہوا آیا جو مسلمان تھا پھر کافر ہو گیا۔ آپ نے اُسے ایک مہینہ تک توبہ کی مہلت دی، پھر اس سے پوچھا، مگر اس نے توبہ سے انکار کر دیا۔ آخر کار آپ نے اُسے قتل کرا دیا (کنز العمال جلد ۱، ص ۸۰)

یہ دس نظیریں پورے دورِ خلافتِ راشدہ کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ چاروں خلفاء کے زمانہ میں جب بھی ارتداد کا واقعہ پیش آیا ہے اس کی سزا قتل ہی دی گئی ہے، اور ان میں سے کسی واقعہ میں بھی نفسِ ارتداد کے سوا کسی دوسرے جرم کی شمولیت ثابت نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ قتل کی سزا دراصل اُس جرم پر دی گئی تھی نہ کہ ارتداد پر۔

**مرتدوں کے خلاف خلیفۂ اول کا جہاد** مگر ان سب نظیروں سے بڑھ کر وزنی نظیر اہلِ ردۃ کے خلاف حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جہاد ہے۔ اس میں صحابۂ کرام کی پوری جماعت شریک تھی۔ اس سے اگر ابتدا میں کسی نے اختلاف کیا بھی تھا تو بعد میں وہ اختلاف اتفاق سے بدل گیا تھا۔ لہٰذا یہ معاملہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے براہ راست نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے دین کی تعلیم و تربیت پائی تھی ان سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ جو گروہ اسلام سے پھر جائے اس کے خلاف اسلامی حکومت کو جنگ کرنی چاہیے۔

بعض لوگ اس جہاد کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ مرتدین کی حیثیت دراصل باغیوں کی تھی کیونکہ انھوں نے حکومت کا ٹیکس (یعنی زکوٰۃ) دینا بند کر دیا تھا اور وہ حکومت کے عاملوں کو الگ کر کے خود اپنی حکومتیں قائم کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ توجیہ چار وجوہ سے قطعی غلط ہے:

اولاً یہ جہاد جن لوگوں کے خلاف کیا گیا تھا وہ سارے کے سارے مانعینِ زکوٰۃ ہی نہیں تھے بلکہ ان میں مختلف قسم کے مرتدین شامل تھے۔ کچھ لوگ ان مدعیانِ نبوت پر ایمان لے آئے تھے جنھوں نے عرب کے مختلف گوشوں میں اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔ کچھ لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین نہ رہا تھا اور وہ کہتے تھے کہ لو کان محمدٌ نبیًا ما مات (اگر محمدؐ نبی ہوتے تو مرتے نہیں)۔ کچھ لوگ تمام ضروریاتِ دین کے قائل تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرنے کے لیے تیار تھے مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنی زکوٰۃ بطورِ خود جمع اور خرچ کریں گے۔ ابوبکرؓ کے عاملوں کو نہیں دیں گے۔ کچھ اور لوگ کہتے تھے:

اطعنا رسول اللہ اذ کان بیننا　　فوا عجبا ما بال ملک ابی بکر

یعنی انھیں اس امر سے اختلاف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا نظام قائم ہو اور سب مسلمانوں کو اسی طرح اس مرکز سے وابستہ رہنے پر مجبور کیا جائے جس طرح وہ رسول اللہ کی شخصیت سے وابستہ تھے۔

ثانیاً، ان سب لوگوں کے لیے صحابہ نے باغی کے بجائے "مرتد" کا لفظ اور اس ہنگامے کے لیے بغاوت کے بجائے "ارتداد" کا لفظ استعمال کیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں وہ اصل جرم جس کے یہ لوگ مرتکب ہوئے تھے، ارتداد تھا نہ کہ بغاوت۔ جنوب عرب میں جن لوگوں نے لقیط

بن مالک الازدی کی نبوت تسلیم کر لی تھی ان کے خلاف حضرت ابو بکر نے عکرمہ بن ابی جہل کو جہاد کے لیے روانہ کرتے وقت یہ ہدایت کی تھی کہ ومن لقیتہ من المرتدۃ بین عمان الی حضرموت والیمن فنکل بہ (عمان سے حضر موت اور یمن تک جہاں مرتدوں کو پاؤ کچل ڈالو)۔

ثالثاً جن لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا ان کے معاملہ میں جب یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ آیا ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنا جائز بھی ہے یا نہیں تو حضرت ابو بکر نے جواب دیا تھا واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ (خدا کی قسم، جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا)۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیفۂ اول کی نگاہ میں اُن کا اصل جرم ٹیکس نہ دینا نہیں تھا بلکہ دینِ اسلام کے دو ارکان میں سے ایک کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا تھا۔ اور آخر کار جس بنا پر صحابۂ کرام نے ان مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے معاملہ میں خلیفہ سے اتفاق کیا وہ یہی تھی کہ خلیفۂ برحق کے دلائل سے انھیں اس امر کا پورا اطمینان ہو گیا کہ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرنے کی وجہ سے یہ لوگ دائرۂ دین سے باہر نکل چکے ہیں۔

رابعاً، ان سب سے بڑھ کر فیصلہ کن چیز سیدنا ابو بکر صدیق کا وہ فرمانِ عام (Proclamation) ہے جو آپ نے عرب کے مختلف گوشوں میں مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے ۱۱ فوجیں روانہ کرتے وقت ہر فوج کے کمانڈر کو لکھ کر دیا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایۃ والنہایۃ (جلد ۶ صہ ۳۱۶) میں یہ پورا فرمان نقل کیا ہے۔ اس کے حسبِ ذیل فقرے خاص طور پر قابلِ غور ہیں؛

"تم میں سے جن لوگوں نے شیطان کی پیروی قبول کی ہے اور جو اللہ سے بے خوف ہو کر اسلام سے کفر کی طرف پھر گئے ہیں ان کی اس حرکت کا حال مجھے معلوم ہوا ...... اب میں نے فلاں شخص کو مہاجرین و انصار اور نیک نہاد تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا ہے اور اسے ہدایت کر دی ہے کہ ایمان کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے، اور

اللہ عزوجل کی طرف دعوت دیے بغیر کسی کو قتل نہ کرے۔ پس جو کوئی اُس کی دعوت الی اللہ کو قبول کرے گا اور اقرار کرنے کے بعد اپنا عمل درست رکھے گا اس کے اقرار کو وہ قبول کر لے گا اور اُسے راہِ راست پر چلنے میں مدد دے گا اور جو انکار کرے گا اس سے وہ لڑے گا یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اس کو حکم دے دیا گیا ہے کہ انکار کرنے والوں میں سے جس پر وہ قابو پائے اسے جیتا نہ چھوڑے، ان کی بستیوں کو جلا دے، ان کو نیست و نابود کر دے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے اور اسلام کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے۔ پس جو اس کی بات مان لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا۔ میں نے اپنے فرستادہ امیر کو یہ بھی ہدایت کر دی ہے کہ میری اس تجویز کو تمھارے ہر مجمع میں سنا دے۔ اور یہ کہ اسلام قبول کرنے کی علامت اذان ہے، جہاں سے اذان کی آواز آئے اس بستی سے تعرض نہ کرو اور جہاں سے یہ آواز نہ آئے وہاں کے لوگوں سے پوچھو کہ وہ کیوں اذان نہیں دیتے، اگر وہ انکار کریں تو اُن پر ٹوٹ پڑو اور اگر اقرار کریں تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جس کے وہ مستحق ہیں"۔

**ائمہ مجتہدین کا اتفاق** اب بحث طویل ہو جائے گی اگر ہم پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی تک کے فقہاء کی تحریریں مسلسل نقل کریں۔ لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسئلہ کے جزئیات میں مذاہبِ اربعہ کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، بہر حال نفسِ مسئلہ کہ مرتد کی سزا قتل ہے، فقہ کے چاروں مذاہب میں متفق علیہ ہے۔ امام مالک کا مذہب ان کی کتاب موطا میں یوں لکھا ہے:

" زید بن اسلم سے مالک نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنا دین بدلے اس کی گردن مار دو۔ اس حدیث کے متعلق مالک نے کہا، جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نبی

صلعم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے طریقہ کا پیرو ہو جائے مگر اپنے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کرتا ہے، جیسا کہ زندیقوں اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کا ڈھنگ ہے، تو اس کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اُسے قتل کر دیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو شخص اسلام سے نکل کر علانیہ کسی دوسرے طریقہ کی پیروی اختیار کرے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے، توبہ کر لے تو خیر ورنہ قتل کیا جائے۔" (باب القضاء فی من ارتد عن الاسلام)

حنابلہ کا مذہب ان کی مستند ترین کتاب "المغنی" میں اس طرح بیان ہوا ہے:

"امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ جو عاقل و بالغ مرد یا عورت اسلام کے بعد کفر اختیار کرے اسے تین دن تک توبہ کی مہلت دی جائے، اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ یہی رائے حسن بصری، زُہری، ابراہیم نخعی، مکحول، حماد، مالک، لیث، اوزاعی، شافعی اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔ (جلد ۱۰ صفحہ ۷۴)

مذہب حنفی کی تصریح امام طحاوی نے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں اس طرح کی ہے:

"اسلام سے مرتد ہونے والے شخص کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر امام اس سے توبہ کا مطالبہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے پھر اگر وہ شخص توبہ کر لے تو چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ امام ابوحنیفہ، ابویوسف اور محمد رحمۃ اللہ علیہم ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے یہ رائے اختیار کی ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ توبہ کا مطالبہ کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ ان کے نزدیک مرتد کی حیثیت حربی کافر کی سی ہے۔ جن حربی کافروں تک ہماری دعوت پہنچ چکی ہے ان کو جنگ شروع کرنے سے پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا غیر ضروری ہے۔ البتہ جنھیں

دعوت نہ پہنچی ہو ان پر حملہ آور ہونے سے پہلے حجت تمام کرنی چاہیے۔ اسی طرح جو شخص اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر مرتد ہوا ہو اس کو تو پہلے سمجھا کر اسلام کی طرف واپس لانے کی کوشش کر لینی چاہیے مگر جو شخص علی وجہ البصیرۃ اسلام سے خارج ہوا ہو اُسے توبہ کی دعوت دیے بغیر قتل کر دیا جائے۔ امام ابو یوسف کا بھی ایک قول اسی رائے کی تائید میں ہے، چنانچہ وہ کتاب الاملاء میں فرماتے ہیں کہ میں مرتد کو قتل کر دوں گا اور توبہ کا مطالبہ نہ کروں گا، ہاں اگر وہ خود ہی جلدی کر کے توبہ کر لے تو میں اُسے چھوڑ دوں گا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کروں گا (کتاب السیر بحث استتابۃ المرتد)

مذہب حنفی کی مزید تصریح ہدایہ میں اس طرح ہے:

"جب کوئی شخص اسلام سے پھر جائے (العیاذ باللہ) تو اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر اسے کوئی شبہ ہو تو اسے صاف کرنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ بہت ممکن ہے وہ کسی شبہ میں مبتلا ہو اور ہم اس کا شبہ دور کر دیں تو اس کا شر ایک بدتر صورت (یعنی قتل) کے بجائے ایک بہتر صورت (یعنی دوبارہ قبول اسلام) سے دفع ہو جائے۔ مگر مشائخ فقہاء کے قول کے مطابق اس کے سامنے اسلام پیش کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ اسلام کی دعوت تو اس کو پہنچ چکی"۔ (باب احکام المرتدین)

افسوس ہے کہ فقہ شافعی کی کوئی معتبر کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے، مگر ہدایہ میں ان کا جو مذہب نقل کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

"شافعی سے منقول ہے کہ امام کو لازم ہے کہ مرتد کو تین دن کی مہلت دے اور اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس سے پہلے اسے قتل کر دے، کیونکہ ایک مسلمان کا ارتداد بظاہر کسی شبہ ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک مدت ضرور ہونی چاہیے جس میں اس کے لیے

غور و تامل کا موقع ہو اور ہم اس غرض کے لیے تین دن کافی سمجھتے ہیں"۔ (باب احکام المرتدین)

غالباً ان شہادتوں کے بعد کسی شخص کے لیے اس امر میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، اور یہ سزا نفس ارتداد کی ہے نہ کسی اور جرم کی جو ارتداد کیساتھ شامل ہو گیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو یہ سب کچھ سن کر پوچھتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے، تو میں ان سے صرف یہ سوال کروں گا کہ تمہاری رائے میں کیا اسلام کا پورا قانون تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو گویا تم یہ کہتے ہو کہ قرآن میں جن افعال کو جرم قرار دے کر سزا تجویز کر دی گئی ہے ان کے ماسوا کوئی فعل اسلامی حکومت میں جرم مستلزم سزا نہ ہوگا۔ پھر ایک مرتبہ غور کر لو کیا اس قاعدے پر تم دنیا میں کوئی حکومت ایک دن بھی کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہو؟ اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ قرآن کے بیان کردہ جرائم اور سزاؤں کے علاوہ اسلامی نظام حکومت میں دوسرے جرائم بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے لیے تفصیلی قانون تعزیرات کی ضرورت ہے، تو میرا دوسرا سوال یہ ہوگا کہ جو قانون نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں رائج تھا اور جس کو مسلسل تیرہ سو برس تک تمام امت کے جج مجسٹریٹ اور علمائے قانون بالاتفاق تسلیم کرتے رہے ہیں، آیا وہ اسلامی قانون کہلانے کا زیادہ مستحق ہے یا وہ قانون جسے آج چند ایسے لوگ تجویز کریں جو غیر اسلامی علوم اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن سے مغلوب و متاثر ہیں اور جن کو اسلامی علوم کی ادھوری تعلیم بھی میسر نہیں آئی ہے؟ (باقی)

# قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(۶)

## دین

**لغوی تحقیق** کلامِ عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اُس پر اپنی قوتِ قاہرہ (Sovereignty) استعمال کرنا، اُس کو اپنا غلام اور تابعِ امر بنانا۔ مثلاً کہتے ہیں دان الناس، ای قھرھم علی الطاعۃ (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا)۔ دِنتُھم فدانوا، ای قھرتُھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مطیع ہو گئے)۔ دِنتُ القوم، ای اذللتھم واستعبدتھم (یعنی میں نے اُس قوم کو مسخر کیا اور غلام بنالیا)۔ دانَ الرجل اذا عزّ (فلاں شخص عزت اور طاقت والا ہو گیا)۔ دِنتُ الرجلَ حملتہ علی ما یکرہُ (میں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے لیے وہ راضی نہ تھا)۔ دُینَ فلان، اذا حُمِل علی مکروہٍ (فلاں شخص اس کام کے لیے بزور مجبور کیا گیا)۔ دِنتہ، ای سُستُہ وملکتہ (یعنی میں نے اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی)۔ دَیَّنتُہُ القوم، ولیتہ سیاستھم (یعنی میں نے قوم کی سیاست و حکمرانی فلاں شخص کو دی)۔ اسی معنی میں حطیئہ اپنی ماں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لقد دُیِّنتِ امرَ بنیکِ حتّٰی    ترکتِھم ادقَّ من الطّحین

(تو اپنے بچوں کے معاملات کی نگراں بنائی گئی تھی۔ آخرکار تو نے انھیں آٹے سے بھی زیادہ باریک کر کے چھوڑا)

حدیث میں آتا ہے الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت یعنی عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کے لیے نافع ہو۔ اسی معنی کے لحاظ سے دیّان اُس کو کہتے ہیں جو کسی ملک یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاہر ہو اور اس پر فرمانروائی کرے، چنانچہ اعشی الحرمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے "یا سید الناس ودیّان العرب"۔ اور اسی لحاظ سے مَدِین کے معنی غلام اور مدینہ کے معنی لونڈی، اور ابنِ مدینہ کے معنی لونڈی زادہ کے آتے ہیں، جیسے اخطل کہتا ہے "ربت وربا فی حجرھا

ابن مدینۃ۔ اور قرآن میں ہے فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یعنی اگر تم کسی کے مملوک، تابع، ماتحت نہیں ہو تو مرنے والے کو موت سے بچا کیوں نہیں لیتے، جان کو واپس کیوں نہیں پلٹا لاتے؟

(۲) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مسخر ہو جانا، کسی کے تحتِ امر ہونا، کسی کے غلبہ و قہر سے دب کر اس کے مقابلہ میں ذلت قبول کر لینا۔ چنانچہ کہتے ہیں دِنتھم فدانوا، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے)۔ دِنتُ الرجل، ای خدمتہ (یعنی میں نے فلاں شخص کی خدمت کی)۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا اریدُ من قریش کلمۃ تَدِینُ لھم بھا العرب، ای تطیعھم وتخضع لھم (یعنی میں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُسے مان لے تو تمام عرب اس کا تابع فرمان بن جائے اور اس کے آگے جھک جائے)۔ اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دِین کہتے ہیں، اور اسی معنی میں دین کا لفظ حدیثِ خوارج میں استعمال کیا گیا ہے یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیۃ[1]۔

(۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملت، رسم و عادت، مثلاً کہتے ہیں مازال ذالک دینی ودیدنی یعنی یہ ہمیشہ سے میرا طریقہ رہا ہے۔ یقال دان اذا اعتاد خیراً اوشراً یعنی آدمی خواہ برے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقہ کا، دونوں صورتوں میں اُس طریقہ کو جس کا وہ پابند ہے دین کہیں گے۔ حدیث میں ہے کانت قریش ومن دان بدینھم، "قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے"۔ اور حدیث میں ہے انہ علیہ السلام کان علی دین قومہ، "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے" یعنی نکاح، طلاق، میراث، اور

[1] اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خوارج دین یعنی ملت سے نکل جائیں گے، کیونکہ حضرت علی سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا اکفارٌ ھم، کیا یہ لوگ کافر ہیں؟ تو آپ نے فرمایا من الکفر فرّوا، کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں۔ پھر پوچھا گیا افمنافقون ھم، کیا یہ منافق ہیں؟ آپ نے فرمایا منافق تو خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ متعین ہوتا ہے کہ اس حدیث میں دین سے مراد اطاعتِ امام ہے۔ چنانچہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں: اراد بالدین الطاعۃ، ای انھم یخرجون من طاعۃ الامام المفترض الطاعۃ وینسلخون منھا (جلد ۲، صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲)

دوسرے تمدنی و معاشرتی امور میں انہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے جو آپ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزاءِ عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تدین تُدان، یعنی جیسا تو کرے گا ویسا بھرے گا۔ قرآن میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے أَئِنَّا لَمَدِينُونَ "کیا مرنے کے بعد ہم سے حساب لیا جانے والا ہے اور ہمیں بدلہ ملنے والا ہے؟" عبداللہ ابن عمرو کی حدیث میں آتا ہے لا تسبوا السلطان فان کان لابد فقولوا اللھم دِنھم کما یدینونا، "اپنے حکمرانوں کو برا نہ کہو اور اگر کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو کہ خدایا جیسا یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں ویسا ہی تو ان کے ساتھ کر۔" اسی معنی میں لفظ دیّان بمعنی قاضی و حاکمِ عدالت آتا ہے، چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علیؓ کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کان دیان ھذہ الامۃ بعد نبیھا، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اس امت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔

**قرآن میں لفظِ دین کا استعمال**

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظِ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں، یا بالفاظِ دیگر یہ لفظ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے:

غلبہ و تسلّط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے،

اطاعت، تعبد اور بندگی صاحبِ اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے،

قاعدہ و ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے،

محاسبہ اور فیصلہ اور جزا و سزا۔

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لیے اور کبھی دوسرے کے لیے اہلِ عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے، مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت زیادہ بلند بھی نہ تھے اس لیے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا اور یہ کسی باقاعدہ نظامِ فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا تھا۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لیے مناسب پا کر بالکل واضح و متعین مفہومات کے لیے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزا سے ہوتی ہے:

۱. حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ،

۲. حاکمیت کے مقابلہ میں تسلیم و اطاعت،

۳. وہ نظامِ فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیرِ اثر بنے،

۴. مکافات جو اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا سرکشی و بغاوت کے صلہ میں دی جائے۔

قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنیٰ اول و دوم پر کرتا ہے، کبھی معنیٰ سوم پر، کبھی معنیٰ چہارم پر، اور کہیں الدین بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزاء سمیت مراد لیتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے حسبِ ذیل آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہوں:

**دین بمعنیٰ اول و دوم**

| | |
|---|---|
| اللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المومن - ۷) | وہ اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس پر آسمان کا قبہ چھایا، جس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں جس نے پاکیزہ چیزوں سے تم کو رزق بہم پہنچایا، وہی اللہ تمہارا رب ہے اور بڑی برکتوں والا ہے وہ رب العالمین۔ وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، لہٰذا تم اسی کو پکارو دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے |
| قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ... قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِیْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهِ ... وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (الزمر - ۲) | کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود سرِ اطاعت جھکاؤں ... کہو میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کی بندگی کروں گا، تم کو اختیار ہے اس کے سوا جس کی چاہو بندگی اختیار کرتے پھرو ... اور جو لوگ طاغوت کی بندگی کرنے سے پرہیز کریں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کریں ان کے لیے خوشخبری ہے۔ |
| اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ | ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کر دی ہے، لہٰذا تم دین کو اللہ |

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ، أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔
(الزمر ۔ ۱)

کے لیے خالص کر کے صرف اسی کی بندگی کرو۔ خبردار ہو، دین خالصۃً اللہ ہی کے لیے ہے۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا، أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ۔
(النحل ۔ ۷)

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے اور دین خالصاً اُسی کے لیے ہے، پھر کیا اللہ کے سوا تم کسی اور سے تقوی کروگے؟ یعنی کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے جس کے حکم کی خلاف ورزی سے تم بچوگے اور جس کی ناراضی سے تم ڈروگے؟

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران ۔ ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کا دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی مطیع فرمان ہیں اور اسی کی طرف ان کو پلٹ کر جانا ہے۔

وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (البینہ ۔)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ یکسو ہو کر دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے صرف اسی کی بندگی کریں۔

ان تمام آیات میں دین کا لفظ اقتدار اعلیٰ، اور اس اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت و بندگی قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حاکمیت، فرماں روائی، حکمرانی اللہ کے سوا کسی کی تسلیم نہ کرے۔ اور اپنی اطاعت و بندگی کو اللہ کے لیے اس طرح خالص کر دے کہ کسی دوسرے کی مستقل بالذات بندگی و اطاعت اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک نہ کرے[1]۔

---

[1] یعنی اللہ کے سوا جس کی اطاعت بھی ہو اللہ کی اطاعت کے تحت اور اس کی مقررہ حدود کے اندر ہو۔ بیٹے کا باپ کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، غلام یا نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا اور اسی نوع کی دوسری تمام اطاعتیں اگر اللہ کے حکم سے ہوں اور ان حدود کے اندر ہوں جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں تو یہ عین اطاعت الٰہی ہیں، اور اس سے آزاد ہوں یا بالفاظ دیگر بجائے خود مستقل اطاعتیں ہوں تو یہی عین بغاوت ہیں۔ حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے، اور اگر ایسی نہیں ہے تو اس کی اطاعت جرم۔

**دین بمعنی سوم**

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (یونس - ۱۱)

کہو کہ اے لوگو! اگر تم کو میرے دین کے بارے میں کچھ شک ہے (یعنی اگر تم کو صاف معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے) تو لو سنو، میں اُن کی بندگی و عبادت نہیں کرتا جن کی بندگی و عبادت تم اللہ کو چھوڑ کر کر رہے ہو بلکہ میں اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تمھاری روحیں قبض کرتا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤں جو اسی اللہ کو ماننے والے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تو یکسو ہو کر اسی دین پر اپنے آپ کو قائم کر دے اور شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف - ۵)

حکمرانی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ... ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ... بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ... فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، سب اُسی کے مطیع فرمان ہیں ... وہ تمھیں سمجھانے کے لیے خود تمھارے اپنے معاملہ سے ایک مثال پیش کرتا ہے۔ بتاؤ، یہ غلام جو تمھارے مملوک ہیں کیا ان میں سے کوئی اُن چیزوں میں جو ہم نے تمھیں دی ہیں تمھارا شریک ہے؟ کیا تم انھیں اس مال کی ملکیت میں اپنے برابر کا حصہ دار بناتے ہو؟ کیا تم اُن سے اپنے ہم چشموں کی طرح ڈرتے ہو؟ ... سچی بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ علم کے بغیر محض اپنے تخیلات کے پیچھے چلے جا رہے ہیں ... پس تم یکسو ہو کر اپنے آپ کو اس دین پر قائم کر دو، اللہ نے جس فطرت پر انسانوں کو پیدا کیا ہے

اکثر الناس لا یعلمون (الروم - ۴)

اُسی کو اختیار کرو[1]، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بدلا نہ جائے، یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ ولا تاخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ (النور - ۱)

زانی اور زانیہ دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو اُن پر رحم نہ آنا چاہیے۔

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق السموات والارض منھا اربعۃ حرم ذلک الدین القیم (التوبہ - ۵)

اللہ کے نوشتے میں تو اُس وقت سے مہینوں کی تعداد ۱۲ ہی چلی آتی ہے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ ان بارہ مہینوں میں سے ۴ مہینے حرام ہیں، یہی ٹھیک ٹھیک صحیح دین ہے۔

کذلک کدنا لیوسف ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک (یوسف - ۹)

اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر نکالی، اُس کے لیے جائز نہ تھا کہ اس بادشاہ کے دین میں اپنے بھائی کو پکڑتا۔

وکذلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم (انعام - ۱۶)

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں[2] نے اپنی اولاد کے قتل کو ایک خوش آئند فعل بنا دیا تاکہ انھیں ہلاکت میں ڈالیں اور اُن کے لیے ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں[3]۔

ام لھم شرکاء شرعوا لھم من الدین

کیا انھوں نے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں جو ان کے لیے دین

[1] یعنی اللہ نے جس ساخت پر انسان کو پیدا کیا ہے وہ تو یہی ہے کہ انسان کی تخلیق میں، اس کی رزق رسانی میں، اس کی ربوبیت میں خود اللہ کے سوا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ نہ اللہ کے سوا کوئی اس کا خدا ہے نہ مالک اور نہ مطاع حقیقی۔ پس خالص فطری طریقہ یہ ہے کہ آدمی بس اللہ کا بندہ ہو اور کسی کا بندہ نہ ہو۔

[2] شریک سے مراد ہے خداوندی و فرماں روائی میں اور قانون بنانے میں خدا کا شریک۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

| | |
|---|---|
| مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ - ۳) | کی قسم سے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے۔ |
| لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون) | تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ |

ان سب آیات میں دین سے مراد قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور وہ نظامِ فکر و عمل ہے جس کی پابندی میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ اقتدار جس کی سند پر کسی ضابطہ و نظام کی پابندی کی جاتی ہے خدا کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ خدا میں ہے، اگر وہ کسی بادشاہ کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ بادشاہ میں ہے، اگر وہ پنڈتوں اور پروہتوں کا اقتدار ہے تو آدمی انہی کے دین میں ہے اور وہ خاندان، برادری یا جمہور قوم کا اقتدار ہے تو آدمی اُن کے دین میں ہے، غرض جس کی سند کو آخری سند اور جس کے فیصلہ کو منتہائے کلام مان کر آدمی کسی طریقے پر چلتا ہے اسی کے دین کا وہ پیرو ہے۔

| | |
|---|---|
| دین بمعنی چہارم إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ وَإِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (الذاریات - ۱) | وہ خبر جس سے تمہیں آگاہ کیا جا رہا ہے (یعنی زندگی بعد موت) یقیناً سچی ہے اور دین یقیناً ہونے والا ہے۔ |
| أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون) | تم نے دیکھا اُس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔ |
| وَمَا أَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَا أَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (انفطار) | تمہیں کیا خبر کہ یوم الدین کیا ہے، ہاں تم کیا جانو کیا چیز ہے یوم الدین وہ دن وہ ہے جبکہ کسی متنفس کے اختیار میں کچھ نہ ہوگا کہ دوسرے کے کام آسکے، اُس روز سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ |

ان آیات میں دین بمعنی محاسبہ و فیصلہ و جزائے اعمال استعمال ہوا ہے۔

(باقی)

(حاشیہ صفحہ سابق) ۵ے دین کو شبہ بنانے سے مطلب ہے کہ جھوٹے شریعت سازی اس گناہ کو ایسا خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے عرب کے لوگ اس شبہ میں پڑ گئے ہیں کہ شاید یہ فعل بھی اسی دین کا ایک جز ہے جو ان کو ابتداءً حضرت ابراہیم و اسماعیل سے ملا تھا۔

# مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

## حصّہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

## حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے :-

### حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

| قیمت حصہ اول | حصہ دوم | حصہ سوم | محصول ڈاک |
|---|---|---|---|
| آٹھ آنے فی جلد | ایک روپیہ آٹھ آنے | ایک روپیہ چار آنے | تین آنے |

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)